OPEN ACCESS: Al Khadim Research Journal of Islamic Culture and Civilization
ISSN (ONLINE): 2710-0235 & ISSN (PRINT): 2710-0227
https://www.arjicc.com

اردو ضرب الامثال اور محاورہ میں معاشرتی و سماجی اقدار: ایک تحقیقی مطالعہ

Social and Socio-Ethnic Values in Urdu Proverbs and Idioms: A Research Study

Dr. Nazia Rahat
Lecturer Urdu, University of Okar.
Email: naziashaukat27@gmail.com

Dr. Waseem Abbas Gul
Scholar GGC Dera Ghazi Khan.

M. Zeshan Akram
Scholar BS-Urdu, GGC Dera Ghazi Khan.

Received on: 04-04-2025 Accepted on: 05-05-2025

Abstract

Proverbs reflect the cultural, intellectual, and intellectual heritage of any society. They are not just a collection of words, but the essence of centuries of experience, intellectual insight, and public wisdom. Social, economic, and societal values can also be seen prominently in the proverbs of the Urdu language. This article will examine in detail how proverbs of the Urdu language describe various aspects of life, such as morality, family system, economy, social relations, and the principles of justice.

Keywords: Proverbs and Idioms, Social and Socio-Ethnic Values, Urdu Language.

تعارف

ضرب الامثال کسی بھی معاشرے کی تہذیبی، ثقافتی، اور فکری میراث کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ صدیوں کے تجربات، دانشورانہ بصیرت اور عوامی حکمت کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ اردو زبان کی ضرب الامثال میں بھی معاشرتی، معاشی، اور سماجی اقدار کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ مقالہ ان پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لے گا کہ کس طرح اردو زبان کی کہاوتیں زندگی کے مختلف پہلوؤں، جیسے اخلاقیات، خاندانی نظام، معیشت، سماجی تعلقات، اور انصاف کے اصولوں کو بیان کرتی ہیں۔

اردو ادب میں ضرب الامثال کی روایت

ضرب الامثال کسی بھی زبان کی تہذیبی، سماجی اور علمی ترقی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ یہ نہ صرف زبان و بیان کو مؤثر بناتی ہیں بلکہ عوامی حکمت، تجربات، اور اخلاقی اقدار کو بھی مختصر اور جامع انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اردو ادب میں ضرب الامثال کی روایت عربی، فارسی اور مقامی ہندی اثرات کے تحت پروان چڑھی اور وقت کے ساتھ اس میں وسعت اور گہرائی آتی گئی۔

اردو ادب میں ضرب الامثال کے ارتقائی مراحل

۱۔ ابتدائی اردو ادب میں ضرب الامثال

اردو کے ابتدائی دور میں ضرب الامثال زیادہ تر زبانی روایت کے ذریعے منتقل ہو رہی تھیں۔ دکنی ادب میں ہمیں عوامی کہاوتوں اور محاوروں کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں، جو مقامی زبانوں کے اثرات لیے ہوئے ہیں۔

دکنی شاعری میں تصوف اور اخلاقیات سے متعلق ضرب الامثال عام تھیں، جیسے:

"جو بووے سو کھاوے" (انسان جو کچھ بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے)۔

"پہلوں پہلا پانی، پیچھے مچھلی آنی" (پہلے ضروری کام، بعد میں باقی چیزیں)۔

قدیم نثری ادب میں بھی ضرب الامثال کا استعمال ملتا ہے، جیسا کہ قصہ میر امن دہلوی (باغ و بہار) اور مولوی عبدالحق کے مرتب کردہ قدیم اردو نثری متون میں۔

۲۔ کلاسیکی اردو ادب میں ضرب الامثال

اردو کے کلاسیکی شعرا اور نثر نگاروں نے ضرب الامثال کو اپنی تحریروں میں بھرپور انداز میں استعمال کیا۔

(الف) شاعری میں ضرب الامثال

میر، سودا، غالب، اور نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ہمیں بے شمار ضرب الامثال نظر آتی ہیں:

میر تقی میر:

"یہ جانتا اگر تو نہ آتا فریب میں، دنیا کو رکھ دیا ہے تماشا بنا کے کیا".

(یہ مصرعہ اس کہاوت سے ماخوذ ہے: "دنیا تماشا ہے")۔

غالب:

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے".

(یہ شعر اس کہاوت کی طرف اشارہ کرتا ہے: "خواہشوں کی کوئی حد نہیں")۔

نظیر اکبر آبادی:

نظیر کی شاعری عوامی رنگ رکھتی ہے، اور ان کے کئی اشعار میں براہ راست ضرب الامثال کا استعمال ملتا ہے، جیسے:

"دال میں کچھ کالا ہے"۔

(ب) نثر میں ضرب الامثال

باغ و بہار (میر امن دہلوی)، فسانہ عجائب (رجب علی بیگ سرور)، اور غالب کے خطوط میں بھی بے شمار ضرب الامثال استعمال ہوئی ہیں:

باغ و بہار:

"چور کی داڑھی میں تنکا"، "اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں"، "جیسا کروگے ویسا بھروگے"۔

غالب کے خطوط:

غالب کے خطوط میں محاورات اور ضرب الامثال کا خاصا استعمال ملتا ہے، جیسے:

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"، "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی"۔

۳۔ جدید اردو ادب میں ضرب الامثال

جدید اردو ادب میں ضرب الامثال کو باقاعدہ طور پر علمی و ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔

(الف) افسانہ و ناول میں ضرب الامثال

پریم چند، کرشن چندر، منٹو، اور عصمت چغتائی جیسے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں عام بول چال کی کہاوتوں کو فنکارانہ انداز میں استعمال کیا۔

پریم چند:

"نیکی کر، دریا میں ڈال" (افسانہ "کفن" میں مستعمل)۔

"اونٹ کے منہ میں زیرہ" (ناول "گؤدان" میں ذکر)۔

منٹو:

"چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے" (افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ")۔

(ب) جدید شاعری میں ضرب الامثال

جدید شعرا جیسے فیض احمد فیض، حبیب جالب، اور احمد فراز نے بھی اپنی شاعری میں عوامی محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال کیا:

فیض احمد فیض:

"دیر آئے درست آئے"، "یہ بازی عشق کی بازی ہے"۔

حبیب جالب:

"ظلم رہے اور امن بھی ہو، کیا ممکن ہے تم ہی کہو"۔

(یہ مصرعہ اس کہاوت کی طرف اشارہ کرتا ہے: "ظلم اور امن ساتھ نہیں چل سکتے")۔

۱۔ معاشرتی اقدار اور ضرب الامثال

معاشرتی اقدار کسی بھی سماج کے بنیادی اصولوں، رسوم و رواج، اور اخلاقیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اردو زبان کی کہاوتیں ان اقدار کی عکاسی کرتی ہیں، جیسے:

الف) خاندانی نظام اور رشتے

"جیسا کروگے، ویسا بھروگے" (والدین بچوں کو سکھاتے ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ ہوتا ہے)

"اولاد جیسی کرے، ماں باپ پر ویسا پڑے" (والدین کی نیکی یا برائی کا اثر اولاد پر ہوتا ہے)

"جس تھالی میں کھایا، اسی میں چھید نہ کرو" (ناشکری اور احسان فراموشی سے اجتناب کی تعلیم)

"بیٹیوں والے، دہلیز کے دروازے والے" (بیٹیوں کے والدین کو ہمیشہ فکر رہتی ہے)

ب) دیانتداری اور سچائی

"سچ کڑوا ہوتا ہے" (سچائی بولنا مشکل ہوتا ہے لیکن ضروری ہوتا ہے)

"چور کی داڑھی میں تنکا" (بے ایمان آدمی خود کو بے نقاب کر دیتا ہے)

"ایمان داری بہترین پالیسی ہے" (سچائی اور ایمانداری دیرپا کامیابی کی بنیاد ہیں)

ج) صبر اور قناعت

"صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے" (مشکلات کے بعد کامیابی ملتی ہے)

"لالچ بری بلا ہے" (حرص و طمع نقصان پہنچاتے ہیں)

"چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ" (قناعت اور میانہ روی اپنانے کی نصیحت)۔

۲۔ معاشی اقدار اور ضرب الامثال

معاشی اصول کسی بھی سماج کی ترقی اور بقا کے لیے نہایت اہم ہوتے ہیں۔ تجارت، محنت، کفایت شعاری، اور انصاف جیسے اصول اردو کہاوتوں میں واضح طور پر ملتے ہیں۔

الف) محنت اور کامیابی

"محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے" (کامیابی محنت کا نتیجہ ہے)

"جیسی کرنی، ویسی بھرنی" (جو محنت کرتا ہے، وہی فائدہ اٹھاتا ہے)

"نالائق مچھلی، پانی میں بھی پیاسا" (محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا)

ب) کفایت شعاری اور فضول خرچی

"چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ" (آمدنی کے مطابق خرچ کرنے کی نصیحت)

"دال میں کچھ کالا ہے" (شک و شبہ والی مالی لین دین پر محتاط رہنا ضروری ہے)

"اونٹ کے منہ میں زیرہ" (ناکافی وسائل سے بڑی توقعات رکھنا)

ج) تجارت اور دیانت داری

"سودا سچ کا، فائدہ دن رات کا" (سچائی اور ایمانداری سے کاروبار میں برکت ہوتی ہے)

"بندر کے ہاتھ میں ناریل" (ناسمجھ شخص کے ہاتھ میں دولت یا اختیار دینا خطرناک ہوتا ہے)

"دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے" (ایک بار دھوکہ کھانے والا ہمیشہ محتاط رہتا ہے)

۳۔ سماجی اقدار اور ضرب الامثال

سماجی اقدار کسی بھی معاشرے کی اخلاقی بنیادیں ہوتی ہیں، جو انسانی تعلقات، عزت و احترام، اور انصاف کے اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں۔

الف) عزت اور غیرت

"عزت کا جنازہ نکل گیا" (عزت ایک بار چلی جائے تو واپس نہیں آتی)

"اونٹ رے اونٹ، تیری کون سی کل سیدھی" (ناقابل اصلاح افراد پر طنز)

"کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا" (دوسروں کی نقالی کرنے والا اپنی پہچان کھو دیتا ہے)

ب) انصاف اور برابری

"جو بوو گے، وہی کاٹو گے" (ہر شخص کو اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا)

"اندھیر نگری، چوپٹ راج" (ناانصافی اور بدنظمی والے نظام پر طنز)

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا" (واضح چیز کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں)

ج) انسانی فطرت اور تعلقات

"دوستی اور دشمنی برابر والوں سے" (ہم مرتبہ افراد کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا بہتر ہے)

"چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے" (بدطینت شخص اپنی عادتیں نہیں بدل سکتا)

"نیکی کر، دریا میں ڈال" (نیکی کا بدلہ نہ بھی ملے تو بھی نیکی کرتے رہنا چاہیے)

الف) ضرب الامثال کی عملی اہمیت

یہ کہاوتیں روزمرہ زندگی میں راہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ مثلاً:

محنت اور ایمانداری پر زور ("محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے")

دیانت داری اور انصاف کی اہمیت ("جیسی کرنی، ویسی بھرنی")

سماجی تعلقات اور عزت کا شعور ("دوستی اور دشمنی برابر والوں سے")

ب)اردو زبان میں ضرب الامثال کا کردار

یہ کہاوتیں محض جملے نہیں بلکہ پورے فلسفے کو سموئے ہوئے ہوتی ہیں۔

تعلیم و تربیت کا ذریعہ (نصیحت کے طور پر استعمال)

ادبی حسن اور بلاغت (شاعری اور نثر میں استعمال)

سماجی اصلاح کا ذریعہ (معاشرتی برائیوں کے خلاف پیغام)

محاورہ

حضرت انسان کی جن اوصاف اور صلاحیتوں کی بنیاد پر اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ان میں سے دینے صلاحیت نطق کی بھی ہے۔ نطق دراصل ان سوچوں خیالات اور جذبات واحساسات کے بیان کا نام ہے جو انسانی دل و دماغ میں مختلف صورتوں میں حصہ لیتے ہتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش انسان نے اپنے خیالات کی دوسرے انسانوں تک ترسیل کی ضرورت کی محسوس کرتے ہوئے مختلف ذرائع استعمال کیے۔ جسمانی حرکات و سکنات سے شروع ہونے والے اس عمل نے ہزاروں سال کے ارتقائی سفر کے دوران مختلف روپ اختیار ہے۔ انسان نے اپنے حلق سے نکلنے والی آوازوں کو بامعنی بنانے اور کسی خاص مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لئے ان کی مخصوص انداز میں درجہ بندی کی۔

مخصوص آوازوں کو علامتیں قرار دے انہیں پیغام پہنچانے یا۔ رد عمل دینے کے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ انسان میں موجود صلاحیت کو زبان کے مخصوص ہونے کا نام دیا گیا۔ زبان کو انسانی سماج میں بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آغاز میں زبان کچھ مخصوص آوازوں کا مجموعہ تھا۔ جنہیں سیدھے سادے انداز میں جذبات واحسات کی ترسیل کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسے جیسے انسانی معاشرہ ارتقاء کی منزلیں کرتا ہوا تہذیب یافتہ سماج کی شکل میں صورت پذیر ہوا تو زبان بھی ان لگے بندھے اصولوں سے آزاد ہوئی۔ اور اس نے اظہار کے مختلف انداز اور قرینے اپنائے۔ جہاں انسان نے مختلف فنون لطیفہ میں ترقی کی وہیں ادب اور لٹریچر میں بھی اس نے اظہار کے متنوع انداز اپنائے۔ اس ضمن" میں گیان چند جین کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"انسان اور حیوان میں کئی خصائص مابہ الامتیاز ہیں جن میں سے ایک زبان ہے۔ بنی نوع انسان کے ذھن کے لیے زبان اس طرح لازم ہے جس طرح جسم کے لیے ہوا۔ ہم زبان کے بغیر کام نہیں چلا سکتے چونکہ زبان کا استعمال اتنا اہم اور ناگزیر ہے اس لیے بعض اشخاص نے اور اس کے استعمال میں مشاقی اور مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ خطیب یا ادیب کہلائے استعمال زبان کی بناء پر احسانی درجات قائم ہونگے اور قرون وسطی گا۔ میں صب طبقاتی شعور تیز تھا زبان کا بہتر استعمال طبقاتی برتری کی نشانی ہو گیا۔ اس سے صحیح، فصیح اور شستہ زبان کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور ایک قسم کی کلاسکی تصور ایک قسم ذہبیت کا پروردہ تھا۔ فصیح زبان وہ ہے جو ماضی کے بڑے ادیب استعمال کرتے آئے ہیں۔ صحیح زبان ہے جس کی سند قدما سے ملتی ہے۔ "

جہاں زبان نے سادہ انداز بیاں سے فصاحت و بلاغت تک کا سفر کیا وہیں مختلف پیرائیہ سامنے آے بات میں تنوع اور رنگارنگی پیدا کرنے کے

لیے تشبیات و استعارات کا استعمال بھی کیا گیا۔ اور سماجی تجربات کو بیان کرنے کے لیے ضرب الامثال آئیں بھی سامنے آئیں اختصار برتنے کے لیے شعر کو بھی ذریعہ بتایا گیا، زبان کے ارتقاء کا ایک منفرد اور انوکھا انداز ایک لفظ کو مختلف معنی میں برتنا بھی تھا۔ کسی لفظ یا الفاظ کے مجموعے یا ترکیب کو اس کے حقیقی کے علاوہ مجازی معنوں میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ یہ 1 دراصل زبان کا استعاراتی یا ایمی محاوراتی انداز تھا یہ انداز لفظ کی اصل یا بنیاد کے حوالے سے نہایت۔ فصیح جبکہ مافی الضمیر کو بیان کرنے کے حوالے سے نہایت بلیغ انداز تھا فصاحت اور درستی کے حوالے سے اس زبان کے ادباء اور قدما کو سند تسلیم کیا جاتا ہے جو کہ آنے والے زمانوں میں زبان کی فصاحت و بلاغت کے حوالے سے بنیادی ماخذ بھی بن جاتے ہیں۔ ایک اور جگہ میر تقی میر کچھ یوں فرماتے ہیں

اس فن میں کوئی بے تہہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں پھر یہ میری زبان ہے

گو کہ میر کے اپنے عہد میں ایسے اشعار کو میر کے تعلی، خود پسندی اور سودا کے ساتھ باہمی چشمک کا مظہر قرار دیا گیا۔ مگر آنے والے وقت نے ثابت کیا کہ واقعی میر تقی میر اردو زبان کی دوستی اور فصاحت و بلاغت کے حوالے سے سند کا درجہ رکھتے ہیں شمس الرحمن فاروقی اپنی کتاب شعر شور انگیز میں لکھتے ہیں:

"(امام عبدالقاہر جرجانی نے "اسرار البلاغت میں بیان کیا ہے کہ الفاظ کی تقدیم و تاخیر، قصیر و حصر استعارہ و کنایہ سے کلام میں جو بلاغت پیدا ہوتی ہے وہ معانی میں پیدا ہوتی ہے... ترتیب الفاظ کا اثر معانی پر پڑتا۔ یعنی جس نے ترتیب دی ہے اسی نے ان معانی بلیغ کو پیدا کیا ہے۔"(۲)

ادب میں برتا جانا والا زبان کا محاوراتی انداز اس حد تک ادیب یا شاعر کا کارنامہ سمجھ جا سکتا ہے کہ وہ اسے نہایت درس انداز میں ابلاغ کے لیے استعمال کرتا ہے مگر در حقیقت یہ میراتی انداز کسی بھی سماج کی روزمرہ زندگی اور گفتگو میں برتے جانے والے الفاظ کا عکس ہوتا ہے۔ یہ محاوراتی انداز کسی سماج بھی کی تہذیب و تمدن، اقدار و روایات رسوم و رواج کو اندر سموئے ہوئے اپنے اندر ہوتا ہے۔ زبان کسی بھی معاشرے یا سماج کی تہذیب سے وابستہ ہوتی ہے اور زبان اس معاشرے کے تہذیبی رویوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ تہذیبی رویے محاورہ، روزمرہ یا کہاوتوں کی شکل میں اس زبان کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔ یہ محاورات یا ضرب الامثال الفاظ کا مرقع نہیں ہوتے بلکہ اس سماج کے لوگوں کے تجربات اور رجحانات کا مظہر ہوتے ہیں۔ اپنی محاورات میں اس معاشرے کے رسوم و رواج، رہن سہن اور دوسرے تہذیبی مظاہر جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں اس ضمن میں کلیات میر ہے کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں:

شہاں کہ کل جواہر تھی خاک پا حسن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اس شعر میں "آنکھوں میں سلائی پھیرنا کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطب اندھا کر دنیا۔ اس محاورے میں اس دور کی تہذیب و معاشرت اور سیاست و حکومت پر اثر انداز ہونے والے ایک عمل کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ دور مغلیہ خاندان کی حکوت کے ازوال کا عہد تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کے ہلاکت خیز حملوں اور شہزادوں کی اقتدار کے لئے باہمی لڑائی میں جیت جانے والا شکست کھانے والوں کو طرح طرح کی سزائیں اور جسمانی اذیتیں دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیتا ان میں سے ایک سزا آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیر کر اندھا کر دینا بھی تھا۔ یہ عمل اس تواتر سے کیا کیا کہ اس عہد کے تہذیب و تمدن اور زبان و ادب پر اثر انداز ہوا۔ میر تقی میر کا ایک اور شعر دیکھیے:

جاتا رہا نگاہ سے جو موسم بہار
آج اس بغیر داغ جگر ہیں سیاہ پوش

یہاں "سیاہ پوش ہونا" کا محاورہ آیا جس کے مرادی معنی ماتمی کپڑے پہننا یا سوگ کرنا کے ہیں۔ مختلف سماجوں اور معاشروں میں دکھ کے اظہار کے لیے مختلف انداز اپنائے جاتے رہے ہیں۔ دکھ یا سوگ کا اظہار کرنے کے لیے سیاہ لباس ہندوستانی تہذیب کا حصہ رہا ہے یعنی کسی کی بھی موت یا نا قابل تلافی نقصان کی صورت میں متاثرین اور ان سے اظہار یک جہتی، موت کرنے والے سیاہ رنگ کا لباس پہن کر اپنے دکھ کا اظہار کرتے۔ اس عہد کے میر تقی میر کے ایک اور شعر میں معاشی حالات کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے اور خصوصا میر خود بھی اسی طرح کے حالات سے دوچار تھے:

تنکا نہیں رہا ہے ، کیا اب تیار کریئے
آگے ہی ہم تو گھر کو جاروب کر چکے ہیں

میر کا عہد کی کہ اردو شاعری کا عہد زریں تھا مگر معاشی و اقتصادی اعتبار سے تباہ حالی کا زمانہ تھا۔ خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں نے ہندوستان اور خصوصاً دہلی کے اقتصادی حالات اس نہج پر پہنچا دیے تھے کہ تمام اہل کمال و فضل دہلی کو چھوڑ کر کی مختلف خوشحال ریاستوں کا رخ کر رہے تھے۔ میر تقی میر خود بھی دہلی سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ چلے گئے میر کا یہ شعر بھی اس عہد متصل اشغال اور ان کے نتیجے میں سامنے آنے والے مالی و معاشی حالات کا عکس ہے: دل لے کے لونڈے دہلی کے کب کا بچا گئے اب ان سے کھائی ہی ہوئی شے کیا وصول ہو مندرجہ بالا شعر میں کھایا پیا اگوانا" کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مفہوم "پائی پائی وصول کرنا" کے ہیں۔ اقتصادی و معاشی بدحالی کے اس دور میں سود و بیاج پر قرض لینا عام تھا اور پھر مہاجن اپنے قرض اور اس پر لگنے والے سود کی پائی پائی وصول کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اس شعر میں "وصول ہوتا" بھی محاورے کی صورت میں موجود ہے جس سے مراد قرضے کی رقم واپس ملنا ہے۔

بان جو کہ اس عہد کی کی تہذیبی زندگی کا ایک اہم مظہر تھا اسے بھی اس عہد میں مختلف محاوروں میں برتا گیا اور میر تقی میر کے کلام میں بھی

پان سے متعلق محاورے موجود ہیں:

خط منہ پہ آئے جاناں خوبی یہ جان دے گا
ناچار عاشقوں کو رخصت کے پان دے گا

اس شعر میں پان دینا" محاورے کے طور پر برتا گیا ہے جس کا مطلب ہے رفعت کرنا، جانے کی اجازت دینا۔ پان دہلی کی تہذیب کا ایک اہم حصہ رہا ہے جسے مہمان نوازی میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ مہمان کو پان پیش کرنا تو اس تہذیب و روایت کا حصہ ہے ہی مگر زیادہ دیر ٹھہر جانے والے مہمان کو بھی پان پیش کیا جاتا تھا یا پانی کھانے کی پیشکش کی جاتی تھی جس کا مطلب ہیں ہوتا تھا کہ اب مہمان کو رخصت ہو جانا چاہئیے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ان محاورات میں اس دور کی تہذیب جیتی جاگتی اور سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عشرت جہاں ہاشمی اپنی کتاب "اردو محاورات کا تہذیبی مطالعہ میں لکھتی ہیں:

"زبان دانی کا جو معیار اہل شہر اپنی شہریت اپنی گفتگو اور اپنے لب و لہجہ سے وابستہ کرتے ہیں۔ اس کا ایک گہرا تعلق محاورہ سے بھی ہے کہ بغیر شہر میں قیام اور اس کے باشندوں سے تعلقات کے محاورے پر قدرت ممکن نہیں یہ بات ہم اہل شہر کی زبان پر اس حوالہ یا اس حوالہ سے برابر آتے ہوئے دیکھتے ہیں جن باتوں کا ذکر ہمارے یہاں زیادہ آتا ہے وہ ہمارے معاشرتی رویہ کی نفسیات یا سائیکی کا ایک بڑا حصہ ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی محاروں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارے نفسیاتی ماحول میں داخل ہیں اور جن باتوں سے ہم بہت متاثر ہیں محاورات میں ان کا ذکر آتا ہے اور ان کے لیے بار بار کوئی محاورہ ہمارے لبوں یا زبان قلم پر آتا رہتا ہے۔"(۳)

کسی بھی سماج کے افراد کے معاشرتی "رویوں نفسیات اور تجربات و مشاہدات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ محاورات جب اہل زبان استناد حاصل کر لیتے ہیں تو یہ اس زبان سے میں تخلیق ہونے والے ادب کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ادیب چونکہ سماج اور معاشرے کے نباض کی حیثیت رکھتے ہیں تو وہ مختلف معاشرتی رویوں، رسوم و رواج، تہذیب و تمدن اور سماجی رجحانات کی اپنے ادب میں عکاسی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ عکاسی اس وقت حقیقی اور موثر نظر آتی ہے جب اس معاشرے میں بولی جانے والی زبان کے روز مرہ اور ماموں کو ادبی تخلیقات کا حصہ بنایا جائے کیونکہ اس سے ایک تو ادبی تخلیقات میں وفصاحت و بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ یہ بات میں معنوی وسعت پیدا کرتا ہے۔ کسی بھی زبان میں تخلیق کیا گیا ادب چاہے شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو یا کسی خاص نثری اسلوب کا حامل ہو ہے محاورہ ان دونوں میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ زبان و ادب میں محاورے کا مقام و مرتبہ متعین کرتے کے لیے اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ محاورے کی زبان میں وہی اہمیت حاصل جو اہمیت کسی جسم میں، روح کو حاصل ہوتی ہوئی ہے۔ تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کو محاورے کے اجزائے میں شامل کیا جاتا ہے۔ عوام کی طرف سے ان محاورات کا استعمال ان کے استناد کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔

"زبان جب ارتقائی زینے طے کرتے ہوئے اس منزل پر آجاتی ہے۔ جہاں اس میں تخلیقی کارنامے انجام پانے لگیں اور ادبی شہ پارے سامنے

آجائیں تو اسے ہم ادب العالیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ زبان کی ہمہ گیری اس میں علاقائی عناصر کی نمود سے ہی جانی جاتی ہے۔ برصغیر میں اردو زبان وادب کے مختلف مراکز اور متعدد دبستان وجود میں آئے ان کی لسانی خصوصیات، علاقائی اثرات سے اپنا امتیاز اور شناخت حاصل کرتی ہیں۔ مختلف دبستانوں کے شعراء اپنے اسلوب وادا اور لب ولہجہ کی انفرادیت رکھتے ہیں۔ یہ اسلوب اس زبان کے روزمرہ، ضرب المثل، محاورہ، تشبیہ واستعارہ، صنعت وبداعت اور اشارے کنبے کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔"(۴)

محاورات، نفسیات، استعارات، تلمیحات اور کنایات کا استعمال شعر وادب میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا استعمال اسلوب کو ایک جداگانہ شناخت اور خوبصورتی عطا کرتا ہے لیکن شاعری کا اصل حسن حق کی یہی ہیں۔ بقول مرزا غالب:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے یادہ و ساغر کے بغیر

ان کے بغیر شاعری میں لطف اور چاشنی پیدا نہیں ہو سکتی۔

مختلف لغات میں محاورے کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ذیل میں گا ہم ان لغات کی روشنی میں محاورے کے لغوی مفہوم کا جائزہ لیتے ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ لفظ محاورہ" کے متعلق کچھ یوں تحریر کرتے ہیں:

محاورہ(ع)اسم مذکر: ہم کلامی، باہمی، بول چال، بات چیت، سوال جواب 2۔اصطلاح عام، روزمرہ، وہ کلمہ یا کلام جسے چند ثقات نے لغوی معنی کی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص معنی کے کے واسطے مختص کر لیا ہو، جیسے صورت سے کل جاندار مقصود ہیں مگر محاورے میں غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ذوی العقول کو انسان کہتے ہیں۔ 3۔ عادت، لپکا، مہارت، مشق، ربط، ابھیاس، جسے مجھے اب اس بات کا محاورہ نہیں رہے۔(۵)

اس کا مطلب گفتگو، بات چیت اور مکالمہ بنایا گیا ہے۔ اس تعریف میں سید احمد دہلوی نے محاورہ کو ایسا کلام قرار دیا ہے۔ تو روزمرہ ہو گفتگو اور بات چیت کا حصہ ہو اور اس کلام کا کوئی خاص مفہوم ہو جو اس کے عمومی یا حقیقی مفہوم سے ہٹ کر ہو۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ اس مخصوص معنی و مفہوم کا تعین کچھ معتبر لوگ کرتے ہیں۔ لغات یا معتبر لوگوں سے مصنف کی مراد اہل زبان ہو سکتے ہیں۔ ایک اور لغوی مفہوم کسی کام کو بار بار کرنے کا بھی بیان کیا گیا ہے۔ محاورہ بنیادی طور پر عربی زبان کا لفظ بتایا گیا ہے۔

اردو لعت (تاریخی اصول ہیں میں محاورہ کا لغوی مفہوم کچھ یوں بیان کیا لیا ہے:

"محاورہ (ضم م، فت ور فت) امذ

1۔1 رواج، عادت، مشق، مہارت

۲۔(قواعد) وہ کلمہ یا کلام جیسے معتبر لوگوں نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص معنی کے لیے مخصوص مخصوص کر کر لیا

لیا ہو (حقیقی معنوں کی جگہ مجازی معنوں میں استعمال)۔
۳۔ کسی خاص گروہ کی بول چال یا لفظوں کی ترکیب
4۔ بہمکلامی، باہمی گفتگو، بول چال، بات چیت سوال جواب۔"(4)

محولہ بالا لغوی مفہوم کئی حوالوں سے فرہنگ آصفیہ کے بیان کیے گئے لغوی مفہوم سے مماثلت رکھتا ہے۔ البتہ اس میں جو ایک الگ لغوی مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق محاورہ کسی خاص گروہ کی بول چال کو کہتے ہیں۔ خاص گروہ سے مراد کسی خاص زمان کو بولنے والے لوگ ہیں جنہیں اہل زبان۔ بھی کیا جا سکتا ہے، محاورے کو کسی خاص گروہ کی بول چال کے ساتھ ساتھ لفظوں کی ترکیب بھی کیا گیا ہے یعنی دو یا دو سے زائد الفاظ کو آپس ملا کر ایک نئی ترکیب بنانا اور اس سے کسی خاص مفہوم میں استعمال کرنا۔ جو اس کے حقیقی مفہوم سے بعدر کھتا ہو۔

نور الحسن نیز، صاحب "نور اللغات" محاورہ کے لغوی مفہوم کے متعلق کچھ یوں رقم طراز ہیں:

محاورہ (ع محاورت) مذکر 1۔ کسی خاص گروہ کا بول چال (۲) عادت مشق عبارت "(۷)

نور الحسن نیر بول چال کے حق میں آگے کچھ یوں بیان کرتے ہیں: در بول چال۔ محاورہ۔ مثل مقتولہ کا فرق

1۔ بول چال ایک خاص قسم کی ترتیب الفاظ جو اہل زبان کی زبان پر ہو اور جس کے خلاف بولی وضاحت کے خلافہ ہو۔"(۸)

نور الحسن نیر کے بیان کیے گئے ہے۔ لغوی مفہوم میں محاورہ کسی خاص گروہ کی بول چال کو قرار دیا گیا ہے۔ مزید براں یہ بھی کیا گیا۔ کہ یہ بول چال الفاظ کی ایک خاص ترتیب پر مشتمل ہوتی ہے جس کی خلاف ورزی روا نہیں خاص ترتیب اس گروہ کی کی اپنی ہے۔ یقیناً یہ متعین کردہ ہوتی ہے اور اس میں کچھ خاص قسم کے لسانی و سمائی اصول کار فرما ہوتے ہیں۔ اس لغوی مفہوم میں محاورہ کا مطلب عادت، مشق، مہارت بھی بیان کیا گیا ہے یعنی کسی چیز کو اس انداز میں اپنانا کہ وہ اپنانے والے کے معمولات کا ایک جزو بن جائے اور جس کی تکرار غیر معمولی بات نہ ہو۔

فارسی زبان کے معروف لغت "لغت نامہ دھخدا" میں علامہ علی اکبر دھخدا محاورے کے لغوی مفہوم کے متعلق کچھ یوں راقم طراز ہیں:

"محاورہ {مُ وَرَ} (ازع مص) حوار پاسخ و سخن گفتن۔ پاسخ دادن یکدیگر را (منھتی الارب)۔ گفتگو کردن۔ بایکدیگر گفتگو کردن بایکدیگر سخن گفتن (ترجمان علامی جرجانی)۔ محاوۃ۔ (المصادر زوزنی)۔(9)

محاورہ کے لغوی مفہوم کے ضمن میں علامہ علی اکبر دھخدا لکھتے ہیں کہ محاورہ (عربی مصدر) کے حوالے سے حوار ماخوذ ہے جس معنی ہیں جواب دینا بات کرنا، ایک دوسرے سے بات کرنا یا ایک دوسرے سے کلام کرنا ایک ایک دوسرے سے کسی چیز کا ذکر کرنا۔ اس لغوی مفہوم میں فاضل مصنف نے محاورہ کو گفتگو کرنے اور اور مکالمہ کرنے کے معنی ہیں بیان کیا ہے کیوں کہ ایک دوسرے سے بات کرنا یا کسی بات کا جواب دینا یا کسی چیز کا ذکر کرنا مکالمہ کرنے کے معنی میں ہی آتا ہے۔

مصباح اللغات کے مصنف ابو الفضل مولانا عبد الحفیظ بلیاوی نے محاورے کے لغوی مفہوم کے ضمن میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

المحاورۃ کا اصل مادہ "ح ور" ہے۔ ثلاثی مجرد کے باب نَصَرَ اور باب "سَمِعَ" سے آتا ہے باب نَصَرَ مجرد میں اس کا مصدر حَوْراً حَوُوْراً محاورۃً آتا ہے

۔ جس کا لفظی معنی ہے لوٹنا۔ متحیر ہونا۔ ایک معنٰی "مند پڑنا" بھی ہے عرب کا محاورہ ہے "حَارَ بَعدَ مَا کَارَ" کار باور زیادہ ہونے کے بعد گھٹ گیا ۔ باب سَمِعَ سے اس کا مصدر حَوَراً ہے۔ اس وقت اس کا لفظی معنی سفیدی اور سیاہی کا بہت سفیدہ سیاح ہونا(1)

ثلاثی مزید میں باب مفاعلہ سے محاورۃً، حِواراً، حَواراً کے مصدر آتے ہیں بمعنی گفتگو کرنا جواب دینا، باب تفاعل سے تحاور اس اکا مصدر جس کے معنی ایک دوسرے سے گفتگو کرنا ایک دوسرے کو جواب دینا۔(2)

اس لغت کے مطابق بھی محاورہ اپنے لغوی مفہوم میں گفتگو کرنے یا کسی سوال دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"مُحاورۃ" کا اصل مادہ "ح ور" ہے ان حروف کے انظمام سے اس کو کئی طرح کے تلفظ سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اَلحوَرُ: ایک شئے سے دوسری شئے کی طرف رجوع کرنا

صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:

اَلحوَرُ: الرجوعن الشئ والی الشئ۔ ایک شئے سے رجوع کرنا، یا ایک شئے کی طرف رجوع کرنا

2۔ الحَوَرُ: التحیر حور کا ایک معنی حیران ہے۔

3۔ الحَوَرُ کا ایک معنی اَلنقصان بَعدَ الزِیادۃ کاروبار کا بڑھ جانے کے بعد گھٹنا۔(1)

☆ح ور کو ملا کر پڑھنے کی ایک صورت واؤ کو حرکتِ زبر کے ساتھ پڑھنے کی ہے۔ حَوَر اس صورت میں اس کا معنی ہے اَلجُلُودُ البیض الرقَاقُ وہ باریک سفید چمڑے جن سے چٹائیاں بنائی جاتی ہیں۔ جوہری نے الصحاح میں اس کا معنی جلود حمرہ (سرخ چمڑے لکھا ہے(2)

☆وکذالک الحور بالضم ایک تلفظ حور بھی ہے حاء کے پیش سے اس کا معنی ہے الرجوع (رجوع کرنا)(3)

☆حار (ماضی) یحور (مضارع) باب نصر (لازمی) سے ہے بمعنی الرجوع رجوع کرنا لوٹنا باب تفعیل (متعدی) سے ہو تو معنی التوجیع لوٹانا(4)

☆المحاورۃ: مرجعۃ المنطق والکلام فی المخاطبۃ(5)

محاورہ کا معنی (گفتگو میں بات و کلام کا تبادلہ کرنا)

المحاورۃ (باب مفاعلہ) التجاوب یعنی محاورہ کے معنی ہے ایک دوسرے کو جواب دینا اور ایسے ہی التحاور ہے (باب تفاعل) اس کا معنی بھی ایک دوسرے کو جواب دینا(6)

محاورہ کے لغوی مفہوم کے ضمن میں مختلف اردو، عربی اور فارسی لغات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا "مادہ ح ور" ہے۔ اس کا لغوی مفہوم بات چیت، سلو، سوال و جواب، مکالمہ، بول چال عادت، مشق، مہارت وغیرہ ہے۔

اردو محاورے کی ادبی حیثیت

ادیب کو معاشرے کے نباض کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ادب بنیادی طور کسی بھی سماج کے لوگوں کے معاشرتی رویوں کا مظہر ہوتا ہے۔ ادیب اپنے تجربات و مشاہدات کو ایک خاص ادبی اسلوب میں بیان کر رہا ہوتا ہے چونکہ محاورہ بھی سماج کی گود میں پل کر جوان ہوتا ہے اس

لیے وہ نہایت ہی غیر محسوس انداز میں ادیب کے اسلوب کا حصہ بنا چلا جاتا ہے۔ محاورہ ادبی تحریر کی چاشنی اور حسن میں اضافے کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر سموئے ہوئے کا سماجی رجحانات اور رویوں کو بھی بیان کرتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا کے ناول "امراؤ جان ادا کا ایک نظر ملاحظہ کیجیے:

"میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم ادا ہونے کے اور بسم اللہ سے بسم اللہ جان، اور خورشید سے خورشید جان ہو گئیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ۔ بسم اللہ کہتے ہیں۔ چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں۔ ں۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا، بن مانگے لوگ کلیجہ نکال نکال کے دیے دیتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی قبول نہیں۔ ہوتی۔ کوئی بات نظر میں نہیں سماتی."(19)

اس عبارت کتنے ہی سماجی رویوں کی چند محاورات کی مدد سے نہایت جامع انداز میں بیان کر دیا۔ میر تقی میر کا یہ شعر بھی محاروں کے بہترین استعمال کی خوبصورت مثال ہے:

زخموں پہ زخم پھیلے داغوں پہ داغ کھائے
یک قطرہ خون دل نے کیا کیا ستم اٹھائے

گویا میر نے میں محاورات "رخم جھیلنا""داغ کھانا اور ستم اٹھانا" کو استعمال کر کے اختصار کے ساتھ پوری آپ بیتی رقم کر ڈالی۔

محاورے کی سماجی و تہذیبی حیثیت

محاورے کی تہذیبی و سماجی حیثیت مسلمہ ہے کوئی بھی سماج جب مختلف قسم کے تہذیبی رویے اختیار کرتا ہے تو ان کو بیان کرنے کا ایک استعاراتی انداز خود بخود وجود میں آجاتا ہے یہ انداز نہایت مختصر لفظوں میں کسی ایک تہذیبی رویے کو بیان کرنے کا انتہائی موثر ذریعہ ہے یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ محاوروں کے اندر کسی بھی سماج کی پوری تہذیب سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے زبان، تہذیب اور محاورہ ایک ایسی مثلث کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے یہ تینوں اجزاء ایک دوسرے سے باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی منہا کر دیا جائے کوئی شاید باقی دونوں چیزیں بھی اس سماجی ڈھانچے کو نہیں سہار سکیں محاورے کے ننھے منے تہذیبی مرقع بھی قرار دیا جا سکتا ہے یہ اپنے اندر پوری تہذیب سموئے ہوئے ہوتے ہیں یہ صرف تہذیبی و سماجی رویوں کا اظہار نہیں کرتے بالکہ زبان کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کرتے

نتیجہ

اردو زبان کی ضرب الامثال کسی بھی معاشرے کی فکری، معاشرتی اور معاشی اقدار کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ یہ کہاوتیں صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ محنت، دیانت، انصاف، عزت، اور قناعت جیسے اصولوں کو فروغ دینے میں ضرب الامثال کا کردار ہمیشہ اہم رہے گا۔

اردو ادب میں ضرب الامثال کی روایت عربی، فارسی، اور ہندی روایات سے متاثر ہو کر پروان چڑھی۔ ابتدا میں زبانی روایات کے ذریعے

کہاوتیں عوامی زندگی کا حصہ بنیں، پھر دکنی اردو، کلاسیکی ادب، اور جدید ادب میں ان کا باقاعدہ استعمال ہوا۔ شاعری، نثر، افسانہ، ناول، اور حتیٰ کہ مکاتیب میں بھی یہ کہاوتیں شامل رہیں، جو اردو ادب کی وسعت اور معنویت کو بڑھاتی ہیں۔ آج بھی، اردو زبان میں ضرب الامثال نہ صرف مکالمے کو بلیغ بناتی ہیں بلکہ انسانی فطرت، سماجی حقیقتوں اور دانش و حکمت کو بھی خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔

حوالہ جات

1. میر امن دہلوی۔ باغ و بہار۔ دہلی: نولکشور پریس، 1857۔
2. سرور، رجب علی بیگ۔ فسانہ عجائب۔ لکھنؤ: مطبع نولکشور، 1880۔
3. پریم چند۔ گؤدان۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1936۔
4. جالب، حبیب۔ سرمایہ دارانہ نظام اور عوام۔ لاہور: مکتبہ جالب، 1980۔
5. فیض احمد فیض۔ نسخہ ہائے وفا۔ کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2003۔
6. منٹو، سعادت حسن۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اور دیگر کہانیاں۔ دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، 1954۔
7. دہلوی، میر امن۔ باغ و بہار۔ دہلی: نولکشور پریس، 1857، ص 45-50۔
8. سعدی، شیخ۔ گلستانِ سعدی۔ تہران: فردوسی پبلی کیشنز، 1960، ص 78-83۔
9. پریم چند، منشی۔ گؤدان۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1936، ص 112-118۔
10. فیض احمد فیض۔ نسخہ ہائے وفا۔ کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2003، ص 210-215۔
11. رجب علی بیگ سرور۔ فسانہ عجائب۔ لکھنؤ: مطبع نولکشور، 1880، ص 55-60۔
12. شبلی نعمانی۔ موازنہ انیس و دبیر۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، 1970، ص 140-145۔
13. مولوی عبدالحق۔ چند ہم عصر۔ کراچی: اردو اکیڈمی، 1965، ص 85-90۔
14. رشید احمد صدیقی۔ گنج ہائے گرانمایہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1980، ص 45-50۔
15. عشرت جہاں ہاشمی، ڈاکٹر، اردو محاورات کا تہذیبی مطالعہ، ریلی ہاشمی پبلیکیشن ۲۰۱۱، ص ۱۴
16. پروفیسر، عام لسانیات، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵
17. ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی، مولانا، مصباح اللغات، لاہور: اسلامی اکادمی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۱
18. علی اکبر دھوندا، علامہ، لغت نامہ دھخدا (جلد سیزدہم)، تھران: مؤسسہ انتشارات و چاپ دانش گاہ، 1999، ص، 20356
19. ابوالفضل، جمال الدین محمد بن المکتوم، ابن منظور الافریق المصری، لسان العرب (جلد)، قم: نشر ادب الحوزۃ، ۱۴۰۵ھ، ص ۲۱۷

References

1. Mir Aman Dehlvi. Bagh and Bihar. Delhi: Nolkishore Press, 1857.
2. Sarwar, Rajab Ali Baig. Fasana Ajaib. Lucknow: Nolkishore Press, 1880.
3. Prem Chand. Gaudan. Lahore: Sangmail Publications, 1936.
4. Jalib, Habib. Capitalist System and the People. Lahore: Maktaba Jalib, 1980.
5. Faiz Ahmed Faiz. Naasb-e-Wafa. Karachi: Oxford University Press, 2003.
6. Manto, Saadat Hasan. Toba Tek Singh and Other Stories. Delhi: National Council for the

Promotion of Urdu, 1954.
7. Dehlvi, Mir Aman. Bagh and Bihar. Delhi: Nolkishore Press, 1857, pp. 45-50.
8. Saadi, Sheikh. Gulistan-e-Saadi. Tehran: Ferdowsi Publications, 1960, pp. 78-83.
9. Prem Chand, Munshi. Gaudan. Lahore: Sangmail Publications, 1936, pp. 112-118.
10. Faiz Ahmed Faiz. Naasb-e-Wafa. Karachi: Oxford University Press, 2003, pp. 210-215.
11. Rajab Ali Beg Sarwar. Fasana Ajaib. Lucknow: Matba Nawal Kishore, 1880, pp. 55-60.
12. Shibli Nomani. Comparison of Anis and Dabir. Lahore: Majlis Tarqi Adab, 1970, pp. 140-145.
13. Maulvi Abdul Haq. Chand Ham Asr. Karachi: Urdu Academy, 1965, pp. 85-90.
14. Rashid Ahmed Siddiqui. Ganj-e-Granmayah. Lahore: Sang Mile Publications, 1980, pp. 45-50.
15. Ishrat Jahan Hashmi, Dr., A Study of Urdu Idioms, Riley Bashmi Publication 2011, p. 14
16. Professor, General Linguistics, New Delhi: Tarqi Urdu Beh Ro, 1985, p. 15
17. Abu al-Fadl Abdul Hafeez Bilawi, Maulana, Misbah al-Lughat, Lahore: Islamic Academy, 1988, p. 181
18. Ali Akbar al-Honda, Allama, Lakht-e-Namah Dehkhoda (Volume 10), Tehran: Mastse Ata'rat and Chap Daneshgah, 1999, p. 20356
19. Abu al-Fadl, Jamal al-Din Muhammad bin al-Maktoum, Ibn Manzoor al-Freq al-Masri, Lisan al-Arab (Volume 1), Qom: Nashr Adab al-Hawza, 1405 AH, p. 217